آیتِ عشق



علی حسین عابدی

علی حسین عابدی قلندروں کو ماننے والا شاعر ہے اور قلندروں کو ماننے والا صاحب نظریہ اور فکر ہوتا ہے وہ ضابطہ حیات و کائنات کو اور اک کی جن پرتوں میں سمو لیتا ہے وہاں کوشش سے اظہارِ ذات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ نظریہ شعر کے ساتھ خود صفحہ قرطاس پر اُترتا بکھرتا سنورتا اور نکھرتا جاتا ہے۔ میں اس کا کون کون سا شعر مثال کے لیے پیش کروں۔

ایک ساعت کو بھلایا تھا غمِ عشق ابھی
بند ہونے لگا تخلیق کا ہر دَر مجھ پر

یا پھر

مجھے یقین ہے ہوگی نہیں شکست کبھی
لگا کے دیکھ لو اک نعرۂ الست کبھی

علی حسین عابدی عہد حاضر کا بڑا شاعر ہے۔ جسے لفظوں کے استعمال سے لے کر خیالات کے برتاوے کا ہنر آتا ہے۔ اس کے باوجود وہ صرف لفظی چابکدستی تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ شعر کہتا ہے اور شعر بھی ایسے جو تیر کی طرح سیدھے دل میں ترازو ہو جاتے ہیں اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

مجھے خبر ہے مری موت کا سبب مرے دوست
بس ایک تیر تمہاری کماں سے نکلے گا

سب بکے گا یہاں بیکسی کے سوا
میں ابھی آرہا ہوں زباں بیچ کر

اس شعر پر تو میری جان فدا:

عابدیؔ کون بتائے گا مرے بعد اُسے
ڈوبتے وقت مجھے اُس کا خیال آیا تھا

فرحت عباس شاہ

۳؍فروری ۲۱۰۸ء، لاہور

آیتِ عشق

آیتِ عشق

علی حسین عابدی

فکشن ہاؤس
○ لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد
e-mail: fictionhouse1991@gmail.com

نام کتاب : آیت عشق

شاعر : علی حسین عابدی
0300-4911577
e-mail:alihussainabidi80@gmail.com

اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : فکشن ہاؤس، لاہور
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : ریاض ظہور
اشاعت اول : نومبر 2018ء
اشاعت دوم : مارچ 2019ء
قیمت : -/400 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-36307550-1,37249218

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس

لاہور ○ کراچی ○ حیدر آباد ○

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

اُن کے نام جنہوں نے آنکھ کھلتے ہی علم اور شعور کی پھونکوں سے دم کیا اور تا دمِ آخر مجھے رنگ بدلنے والی دنیا اور مستقل غم بانٹنے والے زمانے سے خوشی کشید کرنے کا ہنر بخشا

والد محترم

خواجہ مودت حسین مرحوم

والدہ محترمہ

شمیم اختر مرحومہ

فہرست

دیباچہ

تقویم گواہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے انسان اپنے مافی الضمیر کے منضبط اظہار کی تگ و دو میں منہمک رہا ہے۔ درجہ بہ درجہ تحریف کی چھلنی سے گزرنے کے بعد انسان اس قابل ہوا کہ نہایت شستہ اور نفیس پیرائے میں خیالات کو قرطاس پر منتقل کر کے متجسسین و محبانِ لسان و بیان کی تشفی طبع کا باعث بنے۔ زبان و بیان کی بنت اور شکست و ریخت کا سفر تا دمِ حشر جاری رہے گا۔ سابقہ الفاظ متروک ہوتے رہیں گے اور نئی لسانی اختراعات اپنا مقام بناتی رہیں گی۔ مگر ہماری دانست میں صائب رائے یہ ہے کہ قدیم لفظیات کو مروج کرنے کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ کی ترویج و اختراع کی راہ ہموار کی جائے۔

آج بہت سے ترقی یافتہ ممالک اپنی متروک لفظیات اور کلاسکس کو دوبارہ مروج کرنے کے لیے مالی معاونت کے علاوہ سو طرح کے جتن کر رہے ہیں۔ انہیں ادراک ہو چلا ہے کہ دیرپا استقامت کے لیے قدامت کا اشتراک کس درجہ ممد ہے۔ اگر اقوام کی ترقی یا انحطاط کا جدول مرتب کرنا ہو تو وہاں رائج فنونِ لطیفہ اور اس سے وابستہ افراد کی زندگی کا مشاہدہ کیجیے صورتِ حال یکسر واضع ہو جائے گی۔ جو مملکت اپنی سرحدوں میں آباد ماہرین فنونِ لطیفہ کی کفالت سے چشم پوشی کی مرتکب ہوتی ہے وہ اپنی بقا کے زریں اصولوں سے آشنا نہیں ہو سکتی۔ کیا وجہ ہے کہ مغرب کا ہر وہ فرد جو فنون کی کسی صنف سے وابستہ ہے صاحبِ ثروت ہے اور مشرقی ماہرِ فن کو روح اور جسم کا رشتہ برقرار رکھنا محال ہے۔ یقیناً یہ زوال کا

عندیہ ہے اور صاحبانِ عقل و خرد کے لیے سوالیہ نشان بھی۔

تمام فنون اپنی ذات کا منفرد اور جداگانہ اظہار ہیں۔ لہٰذا شاعری کو بھی لفظ سے مشروط نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا توازن پر قائم ہے اور ہر ایسی چیز شاعری ہے جو توازن کی معراج تصور کی جائے۔ شاعری بنیادی طور پر لطیف ذریعہ اظہار ہے جیسے مجسمہ ساز مٹی پتھر سے اظہار پر قدرت رکھتا ہے تو بڑھئی لکڑی پر اپنی فکر مرتسم کرتا ہے اور معمار اپنے تخیل کو مٹی گارے میں ڈھالتا ہے۔

مگر یہ مسلمہ امر ہے کہ فنونِ لطیفہ کی جملہ اصناف میں شاعری ہراول کے درجہ پر متمکن ہے۔ خصوصاً غزل کو شاعری کی جملہ اصناف میں درجۂ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے۔

گو کہ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے کلام کرنا ہے۔ مگر تغیراتِ زمانہ، تبدلِ طرزِ کلام اور جدیدیت کے سبب تقریباً ہر شعبہ ہائے زندگی کے موضوعات کو غزل میں پرو دیا گیا اور تا حال غزل کی کشادہ دامنی غزل گو شعراء کو دعوتِ مبارزت دیتی نظر آتی ہے۔

غزل کہنا اس قدر دشوار ہے کہ جیسے دہکتے انگارے کو ریشم کی ڈور سے باندھ کر گھمایا جائے اور نہ ڈور سوختہ ہو نہ انگارہ سرد پڑنے پائے۔ اس مسلسل عمل کو غزل گوئی سے مماثلت دینا چنداں مبالغہ آرائی نہیں۔ یوں ہی نہیں کہا گیا کہ

صَرف سیروں تن شاعر کو لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

غزل کی تمہید باندھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ محبی علی حسین عابدی کے مجموعۂ غزل ''آیت عشق'' کا مسودہ زیرِ نظر ہے جس پر دیباچہ لکھنے کا حکم صادر ہوا ہے۔ جس کی تکمیل ادائیگی کے اولین مرحلے سے گزر رہی ہے اور نہیں جانتا کہ اپنی مجموعی کوتاہ علمی اور تہی دامنی کے ساتھ کیا تیر مار پاؤں گا۔ بہر حال کوشش کر دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ واثق

اُمید رکھتا ہوں کہ ان سے تعلق بنی بر حقائق تاثرات کے بیان کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہوگا۔

اولاً جب سرسری مطالعہ کیا تو محسوس ہوا کہ مسودہ میں موجود زیادہ تر کلام عمیق مطالعہ کا متقاضی ہے سو دوبارہ سہج سہج کر جگالی کی اور تشنہ روح کی سیرابی میں تادیر منہمک رہا اور بال آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ بلاشبہ زیرِ نظر کلام کسی بھی معیاری دارالمطالعہ کی زینت بننے کے خصائل رکھتا ہے۔

میری ذاتی رائے ہے کہ اچھا شاعر ہونے کے لیے شاعری کے جملہ اوصاف کا شاعر میں موجود ہونا ہی شاعر کو تکمیل ذات سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ کیا کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ خود کو عقل کُل تصور کرتے ہیں۔ شاگردوں کو انسان شمار کرنے کے روادار نہیں۔ نام ونمود کے شیدائی، تسلیم کی خُو سے نابلد۔ خودستائش کے فن میں یکتا۔ ادب میں گروہ بندی کے خوگر اور کمینگی کے رائج الوقت فنون کے داعی کو اکثر بڑا شاعر ماننے کی روایت مستحکم ہو رہی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اُس عالم کا علم بے فیض ہے جس کے حلقہ اثر میں موجود افراد خود کو کم تر جانیں۔ جہاں تکبر در آئے وہاں سے علم رخصت ہو جاتا ہے۔ متکبر متقی سے غیر متکبر گناہ گار بہتر ہے۔ لہٰذا مجھے یہ بات کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ جملہ اوصاف رکھنے والے بڑے شاعر اور ادیب ادب کے کھلے دشمن ہیں۔ جن کے قول وفعل میں بعد المشرقین ہے۔ بات محبت کی کرتے ہیں اور ذہن ودل نفرت اور کدورت کی آماجگاہیں ہیں۔ خدارا ایسے ادب کے رہبروں سے پیچھا چھڑائیے۔

مسلسل محنت سے اچھے اشعار تو کہے جا سکتے ہیں۔ مگر ودیعت کی ہوئی فطرت تبدیل کرنا کارِ مستحیل ہے۔ سلطان العارفین حضرت سلطان باہُو کا قول ہے کہ:

"علم پڑھے اشراف نہ تھیندا جیڑھا منڈھوں ذات کمینہ ہو"

علی حسین عابدی سے میرا تعلق بہت پرانا ہے اور بلا مبالغہ اس تعلق کو دوام بخشنے میں

اُن کا اخلاق، ملنساری، ہر کسی کے لیے غیر مخاصمانہ رویہ، درگزر کی خو اور مخاطب کی دل سے تکریم اوّلیت کی حامل ہے اور ربِ کریم نے چاہا تو یہی اوصاف انہیں دیر پا کامیابی سے ہمکنار کریں گے۔

علی حسین عابدی کی شاعری ہمہ جہت ہے جس میں کسی کے ساتھ بتائے حسین لمحات کی کسک بھی ہے اور ماضی سے تعلق استوار رکھنے کی لپک بھی۔ آنے والے وقت سے بہتری کی اُمید بھی ہے اور گزرے وقت سے شکر رنجی بھی نہیں۔ تعلق نہ توڑنے کا اعادہ بھی ہے اور ماضی میں خود پر ہوئی زیادتیوں سے پہلوتہی بھی۔ بعد از مرگ والدین سے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بھی ہمہ وقت موجزن رہتا ہے اور موجود خونی رشتوں کی شقاوت پر لب بستگی بھی۔ لفظیات کی سحر آفرینی بھی ہے اور ندرتِ خیال بھی الغرض چند ایک غزلوں کو چھوڑ کر زیادہ تر کلام میں توسن خیال کی پرواز کا عملی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

سب بکے گا یہاں بیکسی کے سوا
میں ابھی آ رہا ہوں زباں بیچ کر

یہ شعر دورِ حاضر کے لیے تازیانہ ہے کہ اسلاف کی اقدار کی اس سے بڑی ناقدری کیا ہوگی کہ کوئی زبان تک بیچنے کو عیب نہ جانے۔

دن کار ہائے مشق زمانہ میں کاٹ کر
شب کی ریاضتوں سے کمایا ہوا ہے درد

اس شعر سے تنویر سپرا مرحوم کی شعر یاد آتا ہے۔

دن بھر بچوں کی خاطر محنت مزدوری کرتا ہوں
رات کو اپنی غیر مکمل غزلیں پوری کرتا ہوں

طرزِ بیان کے اختلاف کے ساتھ تقریباً ایک ہی بات کہی گئی ہے۔ مقامِ افسوس ہے

کہ کارخانے کا مزدور تنویر سپرا ہو یا نجی ادارے سے منسلک علی حسین عابدی ایک ہی طرح سے تخلیق کے کرب سے گزرنے پر مجبور کردیے گئے ہیں۔

میں مجسم گھر سے نکلا تھا کمانے کے لیے
اور کاندھوں پر اٹھا کر منتشر لایا گیا

شاعر اس شدت سے دوسرے کے درد کو محسوس کرنے پر قادر ہوتا ہے گویا کسی پر گزرا سانحہ اس کی اپنی ذات سے وابستہ ہو۔ موجودہ دور کی ہو بہو عکاسی ہے کہ گھر سے رزق کی خاطر نکلا شخص شام تک سالم واپس آجائے تو مقامِ شکر ہے۔

مجھ سے چھڑا کے ہاتھ تہہ خاک سو گئی
ماں کا مگر وجود سے سایہ نہیں گیا

اور

جو ہوئے قائم مری ماں کی دعاؤں کے سبب
دھوپ میں جلنے نہیں دیتے وہی سائے مجھے

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ کوئی اپنے دنیاوی تخلیق کار کو فراموش کردے۔ یہ نادیدہ سایہ ہمیشہ انسان کا احاطہ کیے رہتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ضمیر میں زندگی کی رمق موجود ہو۔ محولہ بالا دونوں اشعار ماں سے والہانہ محبت وعقیدت کے غماض ہیں۔

عابدی ٹوٹتے تارے نظر آئے ہیں مجھے
یہ زمیں چھوڑ کے جانے کا اشارہ ہی نہ ہو

ایک مضمون سو طرز سے باندھا جاسکتا ہے۔ زیر نظر شعر اور مرحومہ پروین شاکر کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے دل میں کیوں
کیا محبت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے

جداگانہ طرزِ اسلوب ایک ہی بات کو دو مختلف انداز سے کہنے کی قدرت کا نام ہے۔

غموں کی جب سے ارزانی ہوئی ہے
ندی آنکھوں کی بے پانی ہوئی ہے

بے پانی ہوئی ہے کا استعمال اہل زبان اور جداگانہ طرزِ بیان شعرا ہی کا خاصہ ہے۔ اہل زبان نہ ہوتے ہوئے یہاں تک رسائی کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

فصیل توڑ رہا ہوں رہائی کی خاطر
حصارِ وقت کو اپنا گواہ کرتے ہوئے

مذکورہ شعر انسان کی فطری آزادی کا برملا اظہار ہے۔ حصارِ وقت کو گواہ کرنے کی ترکیب بھی جداگانہ طرزِ احساس ہے۔

عابدی کون بتائے گا میرے بعد اسے
ڈوبتے وقت مجھے اس کا خیال آیا تھا

بہت سی گفتنی ناگفتہ رہ جانے کا احساس اس قدر روح فرسا ہے کہ پڑھ کے روح متزلزل ہو جاتی ہے۔

میں بھوک اوڑھ کے سونے کا ہو گیا عادی
یہ فائدہ تو ہوا مشکلوں میں پلنے کا

شعر میں موجود کرب کو لفظوں میں بیان کرنا کم از کم میرے بس میں تو ہرگز نہیں۔ یعنی اپنی محرومی کو مثبت بیانیہ عطا کرنا۔ اپنی کمزوری کو طاقت بنا لینا ہی ذات میں چھپے گوہر کی معمولی عکاسی ہے جس کے لیے زندگی اور زندگی کے چہار اطراف کا عمیق مشاہدہ

ضروری ہے۔

فلک بشر کے لیے دو قدم کی دوری ہے
دکھاؤں گا میں زمیں سے لگا کے جست کبھی

گو کہ شعر میں شاعرانہ تعلی سے کام لیا گیا ہے مگر انسان کو عطا کردہ کمالاتِ ذات کا برملا اظہار ہے کہ انسان کو اللہ رب العزت نے اس قدر صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ جن کے بروئے کار لانے پر محیر العقول صفات کا مرقع بن سکتا ہے۔

تقدس کے قرینے سب انہی کے دم قدم سے ہیں
انگوٹھے آنکھ چومیں دل کہے صلِ علیٰ جب بھی

نعت پاک کے اس شعر کا انفراد ملاحظہ ہو کہ میں نے ابھی تک کہیں اس مضمون کو اس نفاست سے مزین پیرائے میں مستعمل نہیں دیکھا۔ ممکن ہے اس عمل کی کوئی مذہبی توجیہہ نہ ہو مگر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تقدیس میں شرک اور بدعت سے ہٹ کر ہر روایتی اور غیر روایتی طریقہ روا ہے۔

موت کی حسرت میں آیا تھا بہتر کا گروہ
مل گئی سب کو حیاتِ جاودانی ریت پر

علی حسین عابدی کا خانوادہ چوں کہ غلامانِ اہل بیت سے ہے اس لیے مدحتِ آلِ رسولؐ کی اُٹھان کی منقبت، سلام اور مراثی میں وضاحت سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

عابدی عشق عداوت ہے کہا تھا اک دن
عکس میرا ہی چلانے لگا خنجر مجھ پر

عشق میں انجذاب کا یہ مرحلہ تب آتا ہے جب جذب کی کیفیت انتہا کو پہنچ جائے اور عشق روح میں حلول کر جائے۔ متعجب ہوں کہ وسط عمری میں یہ کمال کیوں کر حاصل کیا جا

سکتا ہے۔

میری مٹی نے مرے پاؤں جکڑ رکھے تھے
اس عقیدت کے سبب نقل مکانی نہیں کی

عشق کی قوسِ قزح مختلف رنگوں سے تشکیل پاتی ہے۔علی حسین عابدی نے اپنے عشق کوفرد تک محدود نہیں کیا۔ بلکہ دھرتی سمیت مختلف مدارج میں منقسم کردیا ہے جوشخصی وثوق اوراعتماد کا مظہر ہے۔یوں تو آیتِ عشق کے ہر شعر پر تبصرہ ممکن ہے مگر طوالت کا خوف مجھے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے رہا۔

آخر میں دعا گو ہوں کہ زیر نظر مجموعہ کلام منصۂ شہود پر آ کر پذیرائی پائے اور علی حسین عابدی کے قلم کو گردوں سے موصلہ رزق کی فراہمی کبھی تعطل کا شکار نہ ہو۔آمین

احقر العباد

علی مزمل

کراچی

خالص غزل کا شاعر

علی حسین عابدی اپنے ہم عصروں میں سب سے منفرد اور انوکھی آواز ہے۔ وہ نہ صرف شاعری کے اسرار و رموز سے مکمل طور پر آگاہ ہے بلکہ خیال کی ندرت کا بھی خیال رکھتا ہے۔ اس کے ہاں روانی تسلسل سے ملتی ہے۔ شاعری وہی دِلوں میں اُترتی ہے جس کی زبان آسان ہو اور اس کام میں علی حسین عابدی کو مہارت حاصل ہے۔ زندگی کے جتنے مسائل ہیں اس نے موتیوں کی طرح اپنی شاعری میں پُرو رکھے ہیں۔ وہ خالص غزل کا شاعر ہے۔ غزل کو تخیل کا لبادہ جو اس نے دیا ہے وہ کم ہی شاعروں کے حصے میں آتا ہے۔ اس حوالے سے آیتِ عشق کا شاعر خوبصورت شعر کہنے میں اپنی مثال آپ ہے۔

محبت، آنسو، کہکشاں، آنچل، صبا، پھول، بادل، ستارے، مہتاب یہ اس کے پسندیدہ حروف ہیں۔ وہ غزل کی خوشنما عمارت تعمیر کرتا ہے۔ وہ محنت کش آدمی ہے اور اپنی روزمرہ کی ذمہ داریوں سے آگاہ ہے۔ شاعری کو اپنے روزگار کی راہ میں دیوار نہیں بننے دیتا۔ یہی اس کا کمال ہے۔ اس نے شاعری کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا اور نہ اُسے شہرت کا چسکا ہے۔ اسی لیے وہ ایک کامیاب شاعر کے طور پر میدانِ ادب میں سرگرمِ عمل ہے اور اپنے فن کا لوہا منوا رہا ہے۔

اقبال راہی

لاہور

سندِ عشق کا حامل شاعر

اظہار کے بہت سے وسیلے ہیں۔ بات کہنا، اظہار کرنا بہت ضروری ہے۔ اپنی بات کہہ دینا ہی جرات کا کام ہے۔ بات کہنے کا سلیقہ بعد کی بات ہے جب بات کہنے کی جرات ہی نہ ہو جب بات کہی ہی نہ ہو تو سلیقہ کہاں سے آئے گا۔ بعض لوگوں میں بات کہنے کی جرات کے باوجود سلیقہ بہت دیر سے آتا ہے اور بہت سے ایسے ہیں جنہیں ساری زندگی یہ سلیقہ نہیں آتا۔ بہت کم لوگ جنہیں میں خوش نصیب ہی کہوں گا ایسے ہوتے ہیں کہ بات کہنے کی جرات بھی کرتے ہیں اور جلد بات کرنے کا سلیقہ بھی جان لیتے ہیں۔ علی حسین عابدی کا تعلق بھی اسی قبیل کے لوگوں سے ہے جو بات کہنے کی جرات پانے کے ساتھ ساتھ بہت جلد بات کہنے کا سلیقہ بھی جان لیتے ہیں۔

علی حسین عابدی اس حوالے سے بھی خوش قسمت ہیں کہ ان کا تعلق شہرِ غزل (منٹگمری) ساہیوال سے ہے۔ اس شہر کی روایت اپنی بات کہہ دینا ہے۔ شہرِ غزل کے ساتھ ساتھ یہ شہر مجید امجد بھی ہے۔ اپنی بات کہہ دینے کے حوالے سے اس شہر کی بہت سی روایتیں ہیں۔ اگر بات کہہ دی گئی اور وہ واقعی بات ہے تو وہ دلوں پر اثر ضرور کرے گی۔ مجید امجد اسی روایت کا روشن ستارہ تھے اور ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اس شہر کی بات کہنے کے حوالے سے روشن مثالیں ہیں۔ جن میں جعفر شیرازی، بشیر احمد بشیر، گوہر ہوشیار پوری، ناصر شہزاد، محمود علی محمود، الف۔د۔نسیم کے علاوہ ان کے بعد آنے والی نسل کی کہکشاں میں ایک روشن ستارہ علی حسین

عابدی ہے جسے روزگار کی فکر شہرِ غزل (منٹگمری) ساہیوال سے بڑے مرکز لاہور لے گئی لیکن وہ شہرِ غزل کی روایت سے جڑا ہوا ہے۔

جدید غزل کے اس دور میں بھی جدید غزل بہت کم کہی جا رہی ہے۔ جدید غزل کے نام پر اوٹ پٹانگ لکھا جا رہا ہے۔ علی حسین عابدی اس سے پہلو بچاتے ہوئے اپنے شہر کی روایت کے مطابق جدید لہجے میں کلاسکیت کا رنگ شامل کر کے اپنی بات سلیقے سے کہہ رہا ہے۔

تب کہیں جا کر ملی ہے عشق کی مجھ کو سند
اولاً تپتے ہوئے صحرا میں جھلسایا گیا

علی حسین عابدی کے پہلے شعری مجموعہ کا نام "آیتِ عشق" ہے۔ یہ نام ہی اس کے جرات اظہار کی عکاسی کرتا ہے۔ عشق اس کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔ اس خارزار میں اس تپتے ہوئے صحرا میں اس بھنور میں کوئی شوق سے نہیں جاتا۔ خود اس کے حصار میں آنے والے کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب اس میں گرفتار ہو گیا۔ عشق کو کچھ عجیب و غریب معانی بھی دیے گئے ہیں جن کا اس سے تعلق بھی نہیں۔ عشق کی تشریح ممکن نہیں ہے بس ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے۔ بلکہ جھیلا جاتا ہے اور بڑی خوشی سے بڑے احترام سے بڑے صبر سے جھیلا جاتا ہے۔

وحدت عشق بھی ہے وحدت خالق کی مثال
عشق میں شرک کا امکان نہ ہونے دینا

یہ کرب بڑے سکون، بڑے احترام، بڑے صبر سے جھیلنا پڑتا ہے اور یہ کرب ہی عشق ہے اور ایسا کرب جو بار بار اسی خارزار، اسی تپتے ہوئے صحرا، اسی بھنور کی طرف لے جاتا ہے۔

کربِ تخلیق کا چھایا رہا منظر مجھ پر
آیتِ عشق اُترتی رہی شب بھر مجھ پر

اس کی غزلوں میں فن تغزل کے ساتھ فکر اور فکر فنی اظہار موجود ہے اور یہی شاعری کی اصل روح ہے۔ اس کا کینوس وسیع ہے۔ عشق کے علاوہ بھی بہت سے مضامین کسی نہ کسی مضبوط حوالے میں زندہ حقیقت کی طرح موجود ہیں۔ وہ شاعری کے بنیادی تقاضے یوں آسانی سے پورے کر رہا ہے جو ایک نوجوان شاعر کے لیے عمومی طور پر مشکل ہوتا ہے۔

چونکہ اسے بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے اس لیے اس کی بات دل میں اتر جاتی ہے۔ دلکش تشبیہوں اور استعاروں سے جو نامانوس بھی محسوس نہیں ہوتے۔ اس نے اپنے اردگرد کے ماحول کی اپنے انداز میں ترجمانی کی ہے اور ان جذبات کو تاثیر اور تاثر کی شعری فضا میں بیان کر کے قاری کو اپنی گرفت میں رکھنے کا ہنر بھی پالیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ شاعروں کے اس قبیل سے تعلق رکھتا ہے جو شعروں کے انبار لگانے کی بجائے اندر سے نکلی ہوئی بات پر اکتفا کرتا ہے اور صرف اپنے اندر سے اُٹھنے والی صداؤں کو شعر کا پیراہن دیتا ہے۔

ابتدا میں سب صدائیں پھر رہی تھیں بے
بدن
پھر صداؤں کو مکمل جسم پہنایا گیا

مختلف موضوعات پر یہ چند اشعار اس کی فنی پختگی کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ اور احساس کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔

واقعے میری جوانی کے سنا بادِ شمال
کون سی شام تھی جو ہم نے سہانی نہیں کی

....

سب بکے گا یہاں بیکسی کے سوا
میں ابھی آ رہا ہوں زباں بیچ کر

....

اول اول کی جوانی میں اُبال آیا تھا
بعد میں جا کے کہیں ضبطِ کمال آیا تھا

....

ہوں اپنی مملکت کا شاہ لیکن
ردائے مفلسی تانی ہوئی ہے

....

موت پر اک کتاب لکھوں گا
زندگی انتساب لکھوں گا

زمانے کی بے حسی کی تصویر دیکھیں:

یہ بات میں نے کسی ولی سے گئے زمانے میں سُن رکھی ہے
وہ دور آئے گا سب کے چہروں سے نفرتوں کا پتہ چلے گا

اور یہ شعر دیکھیں:

ڈھونڈتا ہوں میں لیے آنکھ میں سورج اکثر
کیا ہوئے ہائے مری آنکھ کے تارے شب و روز

ان چند اشعار سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ علی حسین عابدی کا اپنا ڈکشن ہے۔ مانوس تشبیہوں اور استعاروں کو اس نے اپنے معنوں میں استعمال کیا ہے اور خوبصورت شاعری قارئین کو دینے جا رہا ہے۔

دعا کے ساتھ اُمید بھی ہے بلکہ یقین بھی کہ 'آیتِ عشق'، جسے اس نے اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے شعری ادبی حلقوں میں قبولیت کی سند حاصل کرے۔

حرف میں دعا کی برکت کے ساتھ

اوصاف شیخ

ساہیوال (منٹگمری)

اظہارِ تشکر

لفظ چاٹنے لہجوں مافی الضمیر سمجھنے اور رویوں کو جذب کرنے کی صلاحیت سے پروردگار عالم نے بچپن میں ہی نواز دیا تھا۔ انسانی زندگی میں بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور معاشرے کی بگڑتی سنورتی چیختی رُلاتی لمحہ بہ لمحہ بدلنے والی تصویروں اور میرے وجدان سے بہت پرانا اور گہرا رشتہ ہے۔ اپنے اندر کے انسان کے ساتھ ہم کلام ہونے کا نام شاعری ہے۔ لکھنے کو بہت کچھ ہے اور لکھا بھی جانا چاہیے اور کچھ لکھنے کو دل کی خواہش بھی ہے۔ مگر جیسے تیسے کر کے اسے کسی اور وقت پر اُٹھار کھتے ہیں۔ چند سطور اظہارِ تشکر کے طور پر لکھنا ضروری تھیں۔

کتاب سے دوری کسی بھی معاشرے کے زوال کی علامت ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے اس علامت میں بھی دنیا میں علم وشعور ادراک و آگہی سے جڑے ہوئے معاشروں میں ہم نے بے حسی کی اس علامت کو اولاً اپنایا ہوا ہے جس کا ذکر محترم علی مزمل صاحب نے اپنے دیباچہ میں کیا ہے۔ ہر وہ شخص جو اصنافِ ادب میں ایک لفظ لکھتا ہے یا کہتا ہے میرے نزدیک بڑا شاعر، بڑا لکھاری ہے۔ ادبی حلقوں کی دھڑے باز، گروپ بندیوں نے ادب سے وابستگی اور محبت کرنے والے افراد کو بہت دور کر دیا ہے جس کا نقصان موجودہ دور اور آنے والے دور میں ایک کرب اور اذیت کی صورت نمایاں نظر آئے گا اور آنے والی نسلیں بدترین اخلاقی اور انسانی اقدار کی قبور پر ماتم کناں ہوں گی۔ علم وادب کے میدان میں قدم

بہ قدم لحہ بہ لحہ ساعت بہ ساعت سیکھنے اور سیکھنے کا عمل ہی انسانی بقا کی علامت ہے۔ میں بہت شکر گزار ہوں جناب علی مزمل صاحب کا جنہوں نے مجھ طالب علم بلکہ میں تو خود کو آج تک طالب علم ثابت کرنے میں بھی ناکام رہا ہوں، کے مجموعہ کلام ''آیت عشق'' پر دیباچہ لکھنے کی رضامندی کا اظہار فرما کر میرے اندر ایک نئے جذبے اور اُمنگ کو دوام بخشا۔ علی مزمل کی محبت اور رہنمائی کا میں کبھی لفظوں میں اظہار نہیں کر پاؤں گا۔ اقبال راہی کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے محبت اور عزت سے نوازا۔ فرحت عباس شاہ صاحب کی شخصیت ایک درویش انسان کی شخصیت ہے۔ شاہ صاحب کی عاجزانہ طبیعت مجھے ہمیشہ اپنی خامیوں کی نشاندہی میں معاون ثابت ہوئی ہے۔ جناب طاہر عدیم صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے کبھی بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں چھوٹا ہوں۔ ان کی عاجزانہ طبیعت ان کو معتبر بناتی ہے۔ جناب اوصاف شیخ صاحب ساہیوال کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ لوگوں کے لیے ہر وقت کچھ کرنے کا جذبہ ان کے اندر سانس کی طرح دوڑتا ہے۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا۔ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

قارئین سے ملتمس ہوں کہ مشاعروں کی چکا چوند سے دور رہتے ہوئے اپنے روزگار کو زندگی کا اثاثہ جان کر ایک طالب علمانہ کوشش ''آیتِ عشق'' کی صورت میں آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ ''آیتِ عشق'' کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ تاکہ میں اپنی خامیوں، کوتاہیوں کو سدھارنے میں کامیاب ہو سکوں۔

علی حسین عابدی

(منٹگمری) ساہیوال

حمد

یارب تو میری ذات میں پیدا کمال کر
جو بھی ہو لاشعور میں لکھ دوں نکال کر

تیری ثنا کے واسطے الفاظ ہی نہیں
علم و ہنر کے خشک ہیں سوتے، بحال کر

مثبت روایتوں کی امامت نصیب ہو
منفی تصورات کو رو بہ زوال کر

گر تیری ذاتِ پاک کی مدحت عطا ہوئی
چُن دوں گا سارے سیپ کے موتی کھنگال کر

دل سخت ہو گیا ہے خشیت نہیں رہی
صحرا ہے چشمِ خشک اسے برشگال کر

ایسا مجھے بنا کہ جہاں میں نہ کوئی ہو
میرے شعورِ فن کو تو اعلیٰ مثال کر

محبوبِ انبیاء کی شفاعت ملے مجھے
جب لوگ چل پڑیں مجھے مٹی میں ڈال کر

چاروں طرف سے عابدیؔ شیشہ مثال ہو
بغض و حسد کا قلب میں رہنا وبال کر

نعت

شفاعت اُنؐ سے مانگیں گے ملے نورالہدیٰ جب بھی
بلوغت کو نہ پہنچے تھے یہی تھی التجا جب بھی

پنپ سکتی نہیں پھر ظلمتیں دالانِ ہستی میں
منوّر دل ہمارے کر گئے شمس الضحیٰ جب بھی

تقدس کے قرینے سب انہی کے دم قدم سے ہیں
انگوٹھے آنکھ چومیں دل کہے صلِ علیٰ جب بھی

شبِ تاریک روشن ہو گئی انوارِ اقدس سے
شب مہتاب گہنائی اُٹھے بدرالدجیٰ جب بھی

برو زِ حشر پیمانے چھلک جائیں گے آنکھوں کے
ہمارے رو بہ رو آئے رسولِ کبریا جب بھی

سماعت اور بصارت از منہ رفتہ پہنچ جائیں
درِ شاہِ اُمم پہنچیں گدائے مجتبیٰ جب بھی

لبوں سے عابدیؔ کچھ اور اب مانگا نہیں جاتا
دعا اُس در کی مانگی ہے سنے میرا خدا جب بھی

نعت

آپؐ عالی مقام ہیں آقاؐ
واجب الاحترام ہیں آقاؐ

نور پانے کو سبز گنبد کا
لوگ محوِ خرام ہیں آقاؐ

مجھ گنہگار پر نظر کیجیے
آپؐ راحت دوام ہیں آقاؐ

ہر مرض کی دوا درِ اقدس
شافئ خاص و عام ہیں آقاؐ

ربِ تعالیٰ کے اور فرد کے بیچ
ربط خیر الانعام ہیں آقا

عابدیؔ سے غلام کے لب پر
بس درود و سلام ہیں آقا

نذرانۂ عقیدت

کس کو خبر کہاں ہیں ٹھکانے حسینؑ کے
لمحے حسینؑ کے ہیں زمانے حسینؑ کے

میرے بدن کے خون میں گردش اُنہی سے ہے
میں دیکھتا ہوں خواب سہانے حسینؑ کے

لوحِ فلک پہ روشن و ارفع اُنہی کا نام
لوحِ زمیں پہ آئینہ خانے حسینؑ کے

بیٹھا رہوں میں مرقدِ عالی پہ عمر بھر
یوں ہو بسر حیات سرہانے حسینؑ کے

مولا ترے حضور یہی التجا ہے بس
بخشش اگر ملے تو بہانے حسینؑ کے

ہر کندہ ناشناس کو دعوت ہے دیکھ لے
پھیلے ہیں چار سمت گھرانے حسینؑ کے

دورِ یزید عابدیؔ کب کا فنا ہوا
گردش میں آج تک ہیں فسانے حسینؑ کے

جب لٹادی میرے اکبر نے جوانی ریت پر
پھر لکھی تاریخ نے سچی کہانی ریت پر

موت کی حسرت میں آیا تھا بہتر[۲] کا گروہ
مل گئی سب کو حیاتِ جاودانی ریت پر

مرتبہ اب بھی مقدم ہے مقدس خون کا
تا قیامت روئے گا کربل کا پانی ریت پر

چشم بینا دیکھ سکتی ہے تعصب کے بغیر
خون سے لکھّی ہوئی شعلہ بیانی ریت پر

آج بھی حق سر بریدہ برسرِ پیکار ہے
آج بھی طاری ہے مرگِ ناگہانی ریت پر

حشر تک آتی رہے گی اک صدا مرگِ یزید
لعنتیں پڑتی رہیں گی آسمانی ریت پر

آج تک تاریخ میں ملتی نہیں جس کی مثال
عابدیؔ ایسی ہوئی ایذا رسانی ریت پر

وجودِ خواب میں ڈھل کر نڈھال تھوڑی ہے
مرے شعور میں اتنی مجال تھوڑی ہے

زمانہ بیت گیا خود سے رسم و راہ کیے
ہمارا خود سے تعلق بحال تھوڑی ہے

مرے زمین سے اُٹھتے ہوئے وجود کو دیکھ
یہ رقصِ وجد ہے پاگل دھمال تھوڑی ہے

ہر اک مقام پہ قائم رہے ہیں ہوش و حواس
ہماری قیس کے جیسی مثال تھوڑی ہے

عطا ہوئی ہے کسی دردِ انتہا کے عوض
یہ شاعری مرا اپنا کمال تھوڑی ہے

یہ زندگی ہے کسی اور امتحان کا روگ
مرے نصاب میں شامل سوال تھوڑی ہے

حقائقِ غمِ دنیا سے مت چرا آنکھیں
سروں پہ ہجر تنا ہے وصال تھوڑی ہے

ہمیں تو عابدؔی شاعر بنا دیا اُس نے
یہ عشقِ کارِ سخن ہے وبال تھوڑی ہے

❀

شمار کرتے نہیں مجھ کو خاندان میں تم
مجھے یہ ڈال رہے ہو کس امتحان میں تم

مری نگاہ کا ہر زاویہ تمہارے لیے
مرے یقین میں تم ہو مرے گمان میں تم

میں سوچتا ہوں تمہیں ہر خطاب سے پہلے
مرے خیال میں تم ہو مرے بیان میں تم

تمہارا حُسن تمہیں در بہ در پھرائے گا
جو کامیاب نہیں عشق کی اُڑان میں تم

میں کم نصیب کڑی دھوپ کا مسافر ہوں
مقیم دل میں ہو آنکھوں کے سائبان میں تم

شبِ وصال پہ راضی نہیں ضمیر اگر
اکیلے عمر گزارو بھرے جہان میں تم

اگر قرار نہیں عابدیؔ نشانے کو
رکھو گے تیر کو کب تک کڑی کمان میں تم

❀

ندائے ضبط کی ساری کسر نکالتے ہیں
سخن کے پیڑ بھی برگ و ثمر نکالتے ہیں

خیال ایسے اُبھرتے ہیں کاسۂ سر میں
کہ سانپ جیسے زمینوں سے سر نکالتے ہیں

وہ شہرِ دل سے مجھے کر رہے ہیں شہر بدر
میں لوٹ آؤں تو بارِ دگر نکالتے ہیں

کہاں ملیں گے زمانے میں روشنی کے نقیب
جو اپنی آنکھ سے شمس و قمر نکالتے ہیں

وہ اپنی ذات میں محبوس ہو کے بیٹھے ہیں
ہم اپنی ذات کے محبس سے در نکالتے ہیں

جب اپنے سارے اثاثے جلا کے بیٹھ گئے
پھر اُس کی راکھ سے شعلہ شرر نکالتے ہیں

تم اپنی چرب زبانی سے کچھ کمال کرو
ہم اپنی جیب سے اپنا ہنر نکالتے ہیں

بہار ایسا کرشمہ ہے عابدیؔ جس میں
پرند ہائے زمانہ بھی پر نکالتے ہیں

✿

کربِ تخلیق کا چھایا رہا منظر مجھ پر
آیتِ عشق اُترتی رہی شب بھر مجھ پر

ایک ساعت کو بھلایا تھا غمِ عشق ابھی
بند ہونے لگا تخلیق کا ہر در مجھ پر

جاگتے وقت وہی شخص لبادہ تھا مرا
نیم شب کو جو اُتارا گیا پیکر مجھ پر

چیل کوؤں کی طرح کھا گئے رشتے میرے
پھر بھی الزام دھرا جاتا ہے مجھ پر مجھ پر

خلق نے ناوکِ دشنام سے چھلنی کر کے
جبر کے تیر چلائے ہیں برابر مجھ پر

شام ہوتے ہی اُداسی کی ہوا چلتی ہے
ٹوٹ پڑتا ہے خیالات کا لشکر مجھ پر

جب کبھی میری توجہ میں خلل آتا ہے
پھونک دیتا ہے کوئی عشق کا منتر مجھ پر

عابدیؔ عشق عداوت ہے کہا تھا اک دن
عکس میرا ہی چلانے لگا خنجر مجھ پر

نور دل کا جائے گا مسکان جائے گی ضرور
دور اب تم سے رہا تو جان جائے گی ضرور

پاؤں چھو لے گا اگر تو اس کے جا کر ایک بار
ماں تو پھر ماں ہے ترے قربان جائے گی ضرور

دل میں اپنے رکھ محبت اور تو ملنا بھی رکھ
دل کا تیرے مدعا وہ جان جائے گی ضرور

بچپنے کی چوٹ کا گہرا نشاں ماتھے پہ ہے
وہ اگر جب بھی ملی پہچان جائے گی ضرور

زندگی پر اختیارِ مرگ کا غلبہ ہو جب
کس کے روکے سے رکی نادان جائے گی ضرور

صدقِ دل سے مان لے سارے قصور اس کے حضور
اس طرح کرنے سے جھوٹی شان جائے گی ضرور

باندھ لے پختہ ارادہ اہتمامِ عشق کا
اک نہ اک دن عابدیؔ وہ مان جائے گی ضرور

❀

عشق میں جو بھی کیا کذب بیانی نہیں کی
لاکھ اُفتاد پڑی غیبتِ جانی نہیں کی

واقعے میری جوانی کے سنا بادِ شمال
کون سی شام تھی جو ہم نے سہانی نہیں کی

یہ اُسی یارِ طرح دار کا خاصہ ہے کہ جب
حسن کے بھاؤ بڑھے بھی تو گرانی نہیں کی

جو بھی ہم نے کہا خاموش تکلم سے کہا
طیش میں آ کے کبھی شعلہ بیانی نہیں کی

تیری سانسوں کی مہک یاد دلاتی ہے تری
اس لیے کاشت کبھی رات کی رانی نہیں کی

میری مٹی نے مرے پاؤں جکڑ رکھے تھے
اس عقیدت کے سبب نقل مکانی نہیں کی

عابدیؔ عمر گزاری ہے مٹا کر خود کو
رو بہ رو تیرے کبھی اشک فشانی نہیں کی

❀

شکیب وضبط کی جانب نگاہ کرتے ہوئے
وہ خود ہی رو پڑا مجھ کو تباہ کرتے ہوئے

فصیل توڑ رہا ہوں رہائی کی خاطر
حصارِ وقت کو اپنا گواہ کرتے ہوئے

بدن کی چاہ سے بچنا ہے مجھ سے بول پڑا
شعورِ عشق مجھے انتباہ کرتے ہوئے

کہیں یہ دائمی عصیاں کا استعارہ نہ ہو
میں ایک بار نہ جھجکا گناہ کرتے ہوئے

غموں سے عشق ہوا اور گزار دی میں نے
تمام عمر غموں سے نباہ کرتے ہوئے

گزار لی ہے کسی کے خیال میں اتنی
گزر ہی جائے گی جبر و کراہ کرتے ہوئے

میں عابدیؔ ہوں جو اپنی بساط سے بڑھ کر
گزر رہا ہوں چٹانوں میں راہ کرتے ہوئے

سب ناقہ و محمل کو بچانے کے لیے تھا
کب تیر مرا دل کے نشانے کے لیے تھا

اک مرکزی کردار تھا خوابوں کے نگر کا
دراصل وہ تعبیر میں آنے کے لیے تھا

محبوب کا سر حرمت و تکریم کا منبع
زانو کے لیے تھا کبھی شانے کے لیے تھا

محبوب کو مَن جانے کی عُجلت بھی نہیں تھی
مجھ کو تو بہت وقت منانے کے لیے تھا

تحریر مری حُسنِ معانی کا ثمر تھی
اک شعر فقط سب کو رُلانے کے لیے تھا

❀

اہلِ دل دل لگی سے ڈرتے ہیں
ہم تونگر خوشی سے ڈرتے ہیں

اُن کو جینے کی آرزو ہے بہت
اور ہم زندگی سے ڈرتے ہیں

لوگ ظلمت بدست ہیں اکثر
بے سبب روشنی سے ڈرتے ہیں

ٹوٹتا ہے فقط اشارے سے
دل تری نازکی سے ڈرتے ہیں

یاد شدت سے جب بھی آتے ہو
روح کی بے کلی سے ڈرتے ہیں

چوٹ کھائی ہے وہ محبت میں
اب تو ہم عاشقی سے ڈرتے ہیں

عابدیؔ جی رہے ہیں دنیا میں
دل کی بے رہروی سے ڈرتے ہیں

دل سے دل کا فقط رابطہ چاہیے
یاد کا مستقل سلسلہ چاہیے

روز ملنا بھی اتنا ضروری نہیں
رابطوں میں ذرا فاصلہ چاہیے

عکس میرا رہے گا مرے رو بہ رو
بس مرے رو بہ رو آئینہ چاہیے

ہو شرابِ کہن یا شرابِ سخن
بے خودی کا مجھے مشغلہ چاہیے

ابتدائے سفر کا ہوا خاتمہ
عشق کا آخری مرحلہ چاہیے

ڈوب جانے کی خو ہم میں موجود ہے
رُخ پہ چاہِ ذقن برملا چاہیے

وہ سراپا متاعِ بدن سونپ دے
عابدؔی سا کوئی مبتلا چاہیے

❁

وسعتِ قلب کو دالان بنا لیتا ہوں
اجنبی شخص کو مہمان بنا لیتا ہوں

تجربہ شہر گلستاں کا بہت ہے مجھ کو
ایک گل ہو تو گلستان بنا لیتا ہوں

مطمئن ہوں میں بہر طور زمانے والو
شکل جب چاہوں پریشان بنا لیتا ہوں

ہار جانے کا کوئی خوف نہیں ہے مجھ کو
ہار میں جیت کا امکان بنا لیتا ہوں

عابدیؔ گھر کی کوئی چیز اگر ٹوٹ گئی
جوڑ کر کام کا سامان بنا لیتا ہوں

سب یقیں بیچ کر سب گماں بیچ کر
میں تونگر ہوں سود و زیاں بیچ کر

جھڑ گئے میری شاخوں سے برگ و ثمر
پھر بہاریں خریدیں خزاں بیچ کر

اک نیا آشیانہ بناؤں گا میں
برلبِ میکدہ اک مکاں بیچ کر

سب بکے گا یہاں بیکسی کے سوا
میں ابھی آ رہا ہوں زباں بیچ کر

اپنے بچوں کی روزی کماتا رہا
وہ عدالت میں اپنا بیاں بیچ کر

مجھ کثافت زدہ نے گلستان میں
اک نیا گھر لیا تتلیاں بیچ کر

مفلسی روح کی اب بھی پہلے سی ہے
کیا کمایا دلِ نغمہ خواں بیچ کر

عابدیؔ چپ رہا مصلحت کے سبب
کون خوش ہے یہاں آستاں بیچ کر

❀

خشک آ جائے مرے ہاتھ میں تر آ جائے
گر مجھے شاعری کرنے کا ہنر آ جائے

جان دینا تو سعادت ہے رہِ عشق میں دوست
جس کو آنا ہے مرے ساتھ ادھر آ جائے

فاصلہ ہے تو مگر اتنا زیادہ بھی نہیں
جو بھی آتا ہے بلاخوف و خطر آ جائے

آبیاری ہو محبت سے مسلسل جس کی
مر چکے پیڑ پہ پھر کیوں نہ ثمر آ جائے

میں کہوں اس کے لیے اور وہ سنتا ہی رہے
کچھ تو شعروں میں محبت کا اثر آ جائے

کوئی روزن نہ ملے خود سے نکلنے کے لیے
تھک کے بیٹھوں تو مرے سامنے گھر آ جائے

عابدؔ وصف ملا ہے کسی عاشق کے سبب
صرف دو گام چلوں سامنے گھر آ جائے

❀

روح میں عشق کا آغاز ہوا چاہتا ہے
حوصلہ خود پسِ انداز ہوا چاہتا ہے

یہ ترے ربطِ سخن کا ہے وسیلہ مرے یار
جو مجھے باعثِ اعجاز ہوا چاہتا ہے

دیر تک دل کے خرابے میں چراغاں کے لیے
مرتعش پھر سے وہی ساز ہوا چاہتا ہے

دیپ جلتے ہی سرِ چلمن و آنچل ایک دم
راز در راز پسِ راز ہوا چاہتا ہے

بے خودی ایسی ملی ہے تری محفل سے کہ اب
مجھ سا خاکی بھی ہوا باز ہوا چاہتا ہے

میرے بدخواہ ذرا کان لگا کر سن لیں
عابدؔی شہر میں ممتاز ہوا چاہتا ہے

❀

دور رہنا عذاب لگتا ہے
اور ملنا بھی خواب لگتا ہے

چپ رہے تو ہوائیں ساقط ہوں
کچھ کہے تو رباب لگتا ہے

دن میں نکلے تو صورتِ خورشید
رات میں ماہتاب لگتا ہے

تشنگی بانٹتا ہے نظروں کو
دشتِ دل کا سراب لگتا ہے

عشق میں باہمی تعلق بھی
کس قدر پُرحجاب لگتا ہے

عابدیؔ مجھ کو وہ حسیں چہرہ
اک مقدس کتاب لگتا ہے

❀

خود کو حدودِ ضبط میں لایا نہیں گیا
پھر بھی وفورِ کرب سنایا نہیں گیا

گریہ تھا ابتدائے سحر تا بہ انتہا
میری دعا سے عرش ہلایا نہیں گیا

مجھ سے چھڑا کے ہاتھ تہہِ خاک سو گئی
ماں کا مگر وجود سے سایہ نہیں گیا

جس سے بھی ایک بار ملایا گیا ہے ہاتھ
ہم سے تمام عمر چھڑایا نہیں گیا

کہنے کو منفعت کا زخیرہ تھا سامنے
میں کیا کروں کہ خود کو جھکایا نہیں گیا

اک معرفت بدوش ملا تھا مجھے کبھی
لیکن یہ بوجھ مجھ سے اُٹھایا نہیں گیا

دیوانِ زندگی کی غزل کا میں عابدؔ
بے ڈول قافیہ تھا نبھایا نہیں گیا

کچھ محبت کی آن رہنے دیں
فاصلے درمیان رہنے دیں

مجھ پہ پورا یقین ٹھیک نہیں
اک ذرا سا گمان رہنے دیں

درحقیقت جو ہے عطا کر دیں
مصلحت کا بیان رہنے دیں

پرخطر راستہ ہے دنیا کا
ساتھ تیر و کمان رہنے دیں

آپ اپنی نبیڑ لیں صاحب
مجھ پہ میرا دھیان رہنے دیں

لوٹنا ہے جو پستیوں کی طرف
کیوں نہ ہم بھی اُڑان رہنے دیں

عابدیؔ کو کہاں تلاش کریں
چھوڑ دیں میری جان رہنے دیں

❁

تصور بے کراں رکھا گیا ہے
مگر حدِ گماں رکھا گیا ہے

مجھے لا کر بٹھایا ہے وہاں پر
حدف سب کا جہاں رکھا گیا ہے

سحر الفاظ کا سارے بدن میں
لبوں کے درمیاں رکھا گیا ہے

چراغِ زندگی میرا جلا کر
تہ آب رواں رکھا گیا ہے

مری آنکھوں کے پرنالوں میں شاید
کوئی سیلِ رواں رکھا گیا ہے

شجاعت چیز ہی ایسی ہے جس کو
زمانے پر عیاں رکھا گیا ہے

مجھے اک شخص پیارا ہے کہ جس کو
قرینِ جسم و جاں رکھا گیا ہے

خسارا ہی خسارا زندگی ہے
زیاں اندر زیاں رکھا گیا ہے

تیقن سے نوازا ہے کسی کو
کسی کو بدگماں رکھا گیا ہے

جدا کرتا ہوا بے چین لمحہ
ہمارے درمیاں رکھا گیا ہے

مجھے تو عابدیؔ شعر و سخن کا
زمیں پر بادباں رکھا گیا ہے

ہم نے جس دن سے محبت پہ نوازش نہیں کی
بس اُسی دن سے تخیل نے بھی گردش نہیں کی

دیکھئے آ کے مریضِ غمِ دل کی حالت
ہو گئی دیر مگر نبض نے جنبش نہیں کی

وہ بھی منہ موڑ گیا ملکِ عدم کی جانب
سب نے ہوتے ہوئے بیمار کی پرسش نہیں کی

سجدۂ عشق روا ہے جنہیں کرتے ہوں گے
ہم نے بس عشق نبھایا ہے پرستش نہیں کی

ضبط کے ایسے مراحل بھی گزارے ہم نے
اشک اندر کو گرے آنکھ سے بارش نہیں کی

کس عداوت کی سزاوار ہوئے ہیں ہم نے
جز محبت تو کسی چیز کی خواہش نہیں کی

مر گیا عابدیؔ محرومِ تمنا ہو کر
تا دمِ وقت کسی سے بھی گزارش نہیں کی

❀

تلخ یادیں مٹانا چاہتا ہوں
میں تجھے بھول جانا چاہتا ہوں

اک دیے سی مری بساط مگر
جلتا سورج بجھانا چاہتا ہوں

روشنی کے حصول کی خاطر
نفرتوں کو جلانا چاہتا ہوں

کاٹ کر ساہیوال میں بچپن
اب بڑھاپا بتانا چاہتا ہوں

کور چشمو زمیں کے خال و خد
میں تمہیں بھی دکھانا چاہتا ہوں

ان سے کہتا ہوں اپنی مجبوری
میں جنہیں آزمانا چاہتا ہوں

عابدیؔ روکتی ہیں دیواریں
میں تو رستہ بنانا چاہتا ہوں

❀

جس طرح وقت کی سرحد کا کنارا ہی نہ ہو
دن اسی طور گزارا کہ گزارا ہی نہ ہو

ترکِ اُلفت کو زمانہ ہوا لیکن اب تک
ایسا لگتا ہے تجھے دل سے اُتارا ہی نہ ہو

چپ رہے تُو تو لگے جیسے پکارا ہے مجھے
جب پکارے تو لگے جیسے پکارا ہی نہ ہو

سوچ لینے سے غزل ساختہ ہو جاتی ہے
وہ غزل پیش کرو جس کو سنوارا ہی نہ ہو

لوگ تجّار زمانے میں بہت ہیں اب بھی
سوچتے ہیں جو محبت میں خسارہ ہی نہ ہو

زندگی چاہیے سیراب نظر کرنے کو
ورنہ اک آدھ جھلک سے تو گزارا ہی نہ ہو

عابدیؔ ٹوٹتے تارے نظر آئے ہیں مجھے
یہ زمیں چھوڑ کے جانے کا اشارہ ہی نہ ہو

مجھے یقین ہے ہوگی نہیں شکست کبھی
لگا کے دیکھ لو اک نعرۂ الست کبھی

فلک بشر کے لیے دو قدم کی دوری ہے
دکھاؤں گا میں زمیں سے لگا کے جست کبھی

ہزار رنج سموئے ہیں دل کے بیچ مگر
جواں ہے حوصلہ ہمت ہوئی نہ پست کبھی

معاف کر دوں گا اپنے سبھی حریفوں کو
بنا جو اپنے قبیلے کا سرپرست کبھی

حیاتِ فکر کی سانسوں سے منسلک ہے اگر
نہیں ہوا ہوں تفکر سے تنگ دست کبھی

میں خال و خد کو سنواروں گا دیکھ کر خود کو
نظر تو آئے کوئی آئینہ بدست کبھی

یہ کم شناس کسی کو بھی رد نہیں کرتا
اُٹھا کے لے گیا ناصح تو بادہ مست کبھی

یہ زندگی کہ گزرنا نصیب ہے جس کا
کبھی تو کھا کے گزاری ہے فاقہ مست کبھی

یہ عابدیؔ بھی عجب مخمصے میں زندہ ہے
کبھی ہے منکرِ ہستی خدا پرست کبھی

❀

ودائِ ہجر ہے شامِ وصال باقی ہے
کہ زخمِ دل کا ابھی اندمال باقی ہے

ابھی تو دل کے دریچے میں روشنی کی ہے
ابھی تو شہر بدن میں دھمال باقی ہے

میں جس کا نام پکاروں وہ سامنے آ جائے
تمہیں یہ کر کے دکھانا کمال باقی ہے

سبھی نے رنگ لگائے ہوئے ہیں بستی میں
فقط تمہی پہ گرانا گلال باقی ہے

اگرچہ ایک زمانے کے بعد یاد آیا
خیال میں وہ شہِ خوش خصال باقی ہے

ابھی خیات ٹپکتی ہے ہر سخن سے ترے
تری غزل میں ترا ارتحال باقی ہے

سخن سے ربط بنایا ہے عابدیؔ تو نے
ابھی عروج ملے گا زوال باقی ہے

❀

تیرے دل سے نکل کر کدھر جاؤں گا
ہے یہی قول واثق کہ مر جاؤں گا

اس کے در پر محبت کی خیرات کو
اپنے سینے میں لے کر ہنر جاؤں گا

میری حالت اگرچہ دگرگوں سہی
چھوڑ دے ناصحا میں سنور جاؤں گا

کچھ کروں نہ کروں اس جہاں میں اگر
بس محبت کی توقیر کر جاؤں گا

راستی آج کے دور کا گُن نہیں
جھوٹ کے پاؤں پر آج گھر جاؤں گا

عشق کو میں بچاؤں گا تشہیر سے
اور اگر کھل گیا تو مکر جاؤں گا

عابدؔی میں بہاروں کا پروردہ ہوں
پھول کھلنے لگیں گے جدھر جاؤں گا

❁

اول اول کی جوانی میں اُبال آیا تھا
بعد میں جا کے کہیں ضبطِ کمال آیا تھا

میرے وجدان نے بروقت بتایا تھا مجھے
ہجر کا خواب مجھے وقتِ وصال آیا تھا

کو بہ کو پھیل گئی اُس کے بدن کی خوشبو
صاف لگتا ہے وہی زہرہ جمال آیا تھا

خود کو پانے کے لیے خود میں اُتر کر اپنے
بحر و بر ہاتھ کی چھلنی میں کھنگال آیا تھا

وقت کے جبر کی دہلیز پہ بیٹھا جس دم
غم کی تحریک سے خوشیوں پہ زوال آیا تا

اب تو احباب بھی دم بھر کو ٹھٹک جاتے ہیں
جب میں آیا تھا یہاں کتنا نہال آیا تھا

عابدؔی کون بتائے گا مرے بعد اُسے
ڈوبتے وقت مجھے اُس کا خیال آیا تھا

درونِ ضعف جوانی تلاش کیا کرنا
بدن کی شعلہ فشانی تلاش کیا کرنا

لبوں پہ مہر لگا دی گئی ہو جس کے کبھی
پھر اس زباں پہ روانی تلاش کیا کرنا

زمیں کے فرد کے دیدوں میں مر چکا کب کا
زمیں کی کوکھ سے پانی تلاش کیا کرنا

میں مدتوں سے فراموش کر چکا ہوں جسے
وہ بھولی بسری کہانی تلاش کیا کرنا

بہا دیے ہیں سمندر کئی تجھے کھو کر
اب آنسوؤں میں روانی تلاش کیا کرنا

شکیب تھا تو مقدر بھی ساتھ تھا اور اب
زبوں کی شرحِ معانی تلاش کیا کرنا

تمام عمر رگوں میں چلا کے بادِ سموم
صبائے صبحِ سہانی تلاش کیا کرنا

یہ عابدیؔ تو وہی ہے جو یار ہے اپنا
بدن پہ چوٹ پرانی تلاش کیا کرنا

❀

فرش سے سیدھا بلادِ عرش لے جایا گیا
تب صداقت کا پیمبر فرش پر لایا گیا

ہر گھڑی اس کے تشکر میں گزاری زندگی
جس کی قدرت سے خزاں میں پھول مہکایا گیا

تب کہیں جا کر ملی ہے عشق کی مجھ کو سند
اولاً تپتے ہوئے صحرا میں جھلسایا گیا

ایک خطرہ ہر گھڑی رہتا ہے کارِ عشق میں
اک ذرا لغزش ہوئی صدیوں کا سرمایہ گیا

پہلے میرے نام کی تحریر مٹوائی گئی
پھر مجھے بھی برسرِ بازار جھٹلایا گیا

خادمِ بے دام تھا تجھ سے عقیدت کے سبب
میں وہی کرتا رہا جو حکم فرمایا گیا

سرسری نظروں سے نادیدہ مناظر کب دکھے
غور سے دیکھا گیا منظر تو دکھلایا گیا

ابتدا میں سب صدائیں پھر رہی تھیں بے بدن
پھر صداؤں کو مکمل جسم پہنایا گیا

آسماں تانا گیا سر پر طنابیں کھینچ کر
چپہ چپہ اس زمیں پر رزق پھیلایا گیا

میں مجسم گھر سے نکلا تھا کمانے کے لیے
اور کاندھوں پر اُٹھا کر منتشر لایا گیا

اک جھلک دیکھی نہیں ترکِ تعلق کیا ہوا
عابدیؔ اس کی گلی میں دیر تک آیا گیا

❁

جو مدتوں سے مراقبے میں پڑا ہوا ہے
وہ شخص عقبیٰ کی لذتوں سے بندھا ہوا ہے

جسے فضائے سخن میں اُڑنے پہ دسترس تھی
وہ گھٹنوں گھٹنوں ضرورتوں میں گڑا ہوا ہے

میں بے ضمیروں کی صحبتوں میں رہا تھا کچھ دن
جبھی تو میرا ضمیر مجھ سے بڑا ہوا ہے

میں تازہ دم تھا تو راستہ ساتھ چل رہا تھا
جو تھک گیا ہوں تو راستہ بھی کڑا ہوا ہے

رقیب جس کو بتا رہے ہیں قصور میرا
وہ سب فسانہ تو دوستوں کا گھڑا ہوا ہے

مجھے تو لگتا ہے میرے اطراف ماں کا قالب
زمیں پہ اپنے قدم جما کر کھڑا ہوا ہے

وہ عابدیؔ کو متاعِ جاں سے عزیز تر ہے
جو اُس کے ماتھے پہ سرخ جھومر جڑا ہوا ہے

❁

میں نے تجدیدِ غمِ جاں سے نتھارے شب و روز
کتنی مشکل سے پسِ پشت اُتارے شب و روز

زندگی تو نے کبھی قدر شناسی نہیں کی
میں نے بے لاگ عقیدت سے سنوارے شب و روز

آج ناسور بنے ہیں مری یادوں کے لیے
تیرے ہمراہ محبت میں گزارے شب و روز

ڈھونڈتا ہوں میں لیے آنکھ میں سورج اکثر
کیا ہوئے ہائے مری آنکھ کے تارے شب و روز

کتنے مانوس ہوئے تھے مری فطرت کے سبب
جاتے جاتے ہوئے پیچھے سے پکارے شب و روز

عین ممکن ہے کہ ساعت بھی نہ گزرے تم سے
میں نے تنہائی میں جس طرح گزارے شب و روز

عابدیؔ اب بھی گیا وقت رچا ہے مجھ میں
پھر بلاتے ہیں مجھے کر کے اشارے شب و روز

❀

تو نے جس نعمتِ عظمیٰ کو بھلایا ہوا ہے
میں نے اُس عشق کو سینے سے لگایا ہوا ہے

سنگِ بے مایہ کو تکریم کا درجہ دے کر
دل سے پتھر پہ ترا نقش بنایا ہوا ہے

دیکھ نادار کو منت کشِ آزار نہ کر
کوئی منت سے مجھے مانگ کے لایا ہوا ہے

موت روکے گی مرے پیکرِ خاکی کی دھمال
عالمِ کیف مجھے وجد میں لایا ہوا ہے

دشت رہتا ہے مرے لمس کی وسعت کے شمال
جب کہ عالم مرے پوروں سمایا ہوا ہے

شق ہوا جب سے دلِ آبلہ پا تیرے سبب
عشق کے عین کو ابجد سے ہٹایا ہوا ہے

لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں مل کر تجھ سے
اور مجھے دیدہ و دانستہ بٹھایا ہوا ہے

ایک مدت ہوئی تحلیل ہوا ہوں تجھ میں
تیرا قالب مجھے تشکیل میں لایا ہوا ہے

عابدیؔ میں نے ترا ساتھ نبھا کر اب تک
تجھ سے رشتہ تو بہرطور نبھایا ہوا ہے

یہ مقولہ ہے معتبر شاید
زندگانی ہے مختصر شاید

ایسے محبس میں عمر بیت گئی
جس کی دیوار تھی نہ در شاید

میری آواز لوٹ آتی ہے
کوئی رہتا نہیں ادھر شاید

کس بنا پر زمیں نورد رہا
وہ تو رکھتا تھا بال و پر شاید

ہم بھی وہم و گمان کے مابین
وقت کرتے رہے بسر شاید

جو زمیں پر نہیں ملا ہے ہمیں
وہ ملے آسمان پر شاید

اُس کی بو باس ہی نہیں ملتی
عابدؔی کا نہیں یہ گھر شاید

میں خوش ہوا ہوں طویل اعتکاف کرتے ہوئے
ردائے مرگ بدن کا غلاف کرتے ہوئے

نہ جی سکوں گا میں ترکِ تعلقات کے بعد
میں منفعل ہوں بہت انتصاف کرتے ہوئے

ذرا بھی ہاتھ میں لرزش نظر نہیں آئی
بقا کا فیصلہ اپنے خلاف کرتے ہوئے

اب آنے والوں کی تعظیم مجھ پہ واجب ہے
گزار لی بہت شین قاف کرتے ہوئے

اُتر گئی مرے دل تری نوید وصال
غموں کے کوہِ گراں میں شگاف کرتے ہوئے

میں اپنی ہجو لکھوں گا ذرا جو وقت ملا
نہیں ہوں چیں بہ جبیں اعتراف کرتے ہوئے

میں اس ادائے دلِ کم سخن کو کیا سمجھوں؟
جو منحرف بھی نہیں انحراف کرتے ہوئے

بہت فراخ طبیعت سے جا رہا ہوں عدم
میں اپنے قتل پہ سب کو معاف کرتے ہوئے

میں پا گیا ہوں حیات و ممات کا مخزن
خود اپنے کعبۂ دل کا طواف کرتے ہوئے

برونِ ذات کثافت سے اٹ گیا ہے بدن
اس آئینۂ رگِ دل کو صاف کرتے ہوئے

ضمیر اب بھی مرا عابدیؔ مصدّق ہے
ندامتیں بھی نہیں اختلاف کرتے ہوئے

❀

غموں کی جب سے ارزانی ہوئی ہے
ندی آنکھوں کی بے پانی ہوئی ہے

یہاں شاید میں پہلے آ چکا ہوں
یہ بستی جانی پہچانی ہوئی ہے

ہوں اپنی مملکت کا شاہ لیکن
ردائے مفلسی تانی ہوئی ہے

تمہارا قرب جب سے پا لیا ہے
کڑی مشکل میں آسانی ہوئی ہے

کبھی قابو میں رہتا ہی نہیں ہے
نہ جانے دل نے کیا ٹھانی ہوئی ہے

محبت ایک اندھی راہبہ ہے
یہ ضرب المثل بھی مانی ہوئی ہے

اُسے ہم عابدیؔ خوش رو لگے ہیں
یہی ہم سے بھی نادانی ہوئی ہے

❀

کوئی مقام نہیں ہے کسی سے جلنے کا
رواج عام ہوا راستہ بدلنے کا

اب اپنی آگ میں جلتے رہو سدا کے لیے
کہا تھا کس نے تمہیں نفرتوں میں ڈھلنے کا

میں بھوک اوڑھ کر سونے کا ہو گیا عادی
یہ فائدہ تو ہوا مشکلوں میں پلنے کا

میں ایک لمحہ تغافل نہیں کروں گا کبھی
ملے گا اذنِ سفر جب بھی ساتھ چلنے کا

وہ چاند رات شبِ بے قرار کی یادیں
پھر انتظار کرو چاند کے نکلنے کا

خیالِ زہرہ جبیں میں تیاگ دی دنیا
سبب بنا ہے دلِ زار رُخ بدلنے کا

کچھ اتنی بار مجھے عابدیؔ ڈبویا گیا
کہ راز سیکھ گیا ڈوب کر نکلنے کا

❀

نہ جانے ہم کو زمیں پہ کس دم عنایتوں کا پتہ چلے گا
دلوں کے زنداں میں بین کرتی محبتوں کا پتہ چلے گا

یہ بات میں نے کسی ولی سے گئے زمانے میں سن رکھی ہے
وہ دور آئے گا سب کے چہروں سے نفرتوں کا پتہ چلے گا

ابھی کشاکش بنی ہوئی ہے تو شمعِ محفل بنے ہوئے ہو
جو دستِ غیبی نے ڈور کھینچی تو حسرتوں کا پتہ چلے گا

ابھی ہتھیلی کی سب لکیریں تمہارے ہاتھوں پہ مرتکز ہیں
جو آ گیا انتشار ان میں تو قسمتوں کا پتہ چلے گا

اگر یہ دنیا عروج پا کر بدن کی لذت سے ہٹ گئی تو
کتابِ دل میں بیان ہوتی روایتوں کا پتہ چلے گا

اگر شکم کے معاملے سے ذرا سی فرصت مجھے ملی تو
دماغ و دل میں پنپتی اُٹھتی بغاوتوں کا پتہ چلے گا

جلالِ حشمت میں عابدیؔ سب تمہارا سایہ بنے ہوئے ہیں
مصیبتوں میں کبھی گھرو گے تو دوستوں کا پتہ چلے گا

❀

تالاب مری اشک فشانی سے بھرے ہیں
اوراق زندگی کی کہانی سے بھرے ہیں

افسانوں میں اک طور بڑھاپے کی جھلک ہے
اشعار مگر شوخ جوانی سے بھرے ہیں

تعبیر کی گتھی کہ سلجھتی ہی نہیں ہے
سب خواب ہی تشکیکِ معانی سے بھرے ہیں

معدوم ہے تہذیب و تمدن کی روایت
یہ شہر فقط نقل مکانی سے بھرے ہیں

میں خشک خیالوں کا امیں ایک جزیرہ
اطراف مرے کھار کے پانی سے بھرے ہیں

خاکسترِ خاموش ہوا بیٹھا ہوں لیکن
افکار مرے شعلہ فشانی سے بھرے ہیں

❀

کون ہے جو نامۂ تحریر میں لائے مجھے
کون ہوں کیسا ہوں میں آئینہ دکھلائے مجھے

کوئی ایسا ہے جسے میرا زمانہ یاد ہو
جو مرا ماضی سنا کر وجد میں لائے مجھے

جو ہوئے قائم مری ماں کی دعاؤں کے سبب
دھوپ میں جلنے نہیں دیتے وہی سائے مجھے

اپنے اندر خود کو پانے کی کروں میں جستجو
دے گیا تھا اک قلندر کان میں رائے مجھے

ہر اذیّت اک نیا در منکشف کرتی رہی
زندگی تیرے ستم سارے بہت بھائے مجھے

عابدی کب سے میں تنہا پھر رہا ہوں دہر میں
وقت آ کر جامۂ اشراف پہنائے مجھے

❀

بھیجا ہوا ہے اور نہ بلایا ہوا ہے درد
مہمان بن کے دل میں سمایا ہوا ہے درد

آنکھوں سے اک جھڑی ہے مسلسل لگی ہوئی
لگتا ہے عاشقی کا ستایا ہوا ہے درد

ہم ہیں جزائے تیرہ شبی میں گندھے ہوئے
اپنی رضا سے دل سے لگایا ہوا ہے درد

جیسے ملائے رندِ خرابات مے سے مے
ہم نے بھی شامِ غم میں ملایا ہوا ہے درد

جس اشتہائے عشق کو صدیاں گزر گئیں
مشکل سے اُس مقام پہ لایا ہوا ہے درد

دن کار ہائے مشقِ زمانہ میں کاٹ کر
شب کی مشقتوں سے کمایا ہوا ہے درد

پہلے پہل تو درد ورائے گمان تھا
اور اب سرورِ ضبط کو بھایا ہوا ہے درد

اک فردِ ناشناس کی چاہت میں عابدیؔ
مدت ہوئی کہ دل نے بھلایا ہوا ہے درد

❀

کب خزانہ تلاش کرتا ہوں
آب و دانہ تلاش کرتا ہوں

جس زمانے کو ہے تلاش مری
وہ زمانہ تلاش کرتا ہوں

لے کے دریا کو اپنی مٹھی میں
کوئی پیاسا تلاش کرتا ہوں

کام دھندا ہے اب یہی میرا
کام دھندا تلاش کرتا ہوں

تیرا چہرہ تو ہر طرف پایا
اپنا چہرہ تلاش کرتا ہوں

تھک گیا ہوں تلاش کر کر کے
پھر دوبارہ تلاش کرتا ہوں

ایک منظر حسیں بنایا ہے
آنکھ والا تلاش کرتا ہوں

راکھ کا ڈھیر ہے مرے آگے
اُس میں شعلہ تلاش کرتا ہوں

عابدیؔ بے گھری نے مار دیا
شب بسیرا تلاش کرتا ہوں

✿

تو آنکھ کے رستے سے مرے دل میں اُتر جا
تو اشکِ وفا بن کے ان آنکھوں میں ٹھہر جا

مرجھائے ہوئے پھولوں کو اک رنگ نیا دے
اُلفت کی ادا بن کے تو رستے سے گزر جا

تو میری خزاں شب کے اندھیروں کو کرن دے
خوشبو کی طرح دل میں ہر اک سمت بکھر جا

خاموش ہیں الفاظ مرے ان کو زباں دے
اس زلف سے کہہ دے کسی لمحے تو سنور جا

کچھ اور نہیں دل میں تمنا مگر اے جاں
تو پہلے ہی اک پھول ہے اب اور نِکھر جا

❀

درد جاگے ہیں خواب سوتے ہیں
چاند پا کر اندھیرے روتے ہیں

زخم ملنے کا کیا گلہ کرتے
کاٹتے ہیں وہی جو بوتے ہیں

جب محبت فریب دیتی ہے
بے وفائی کو اشک دھوتے ہیں

صرف مطلب نکالنے کے لیے
لوگ میرے قریب ہوتے ہیں

لوگ نظروں کے تیر محفل میں
پیکرِ حُسن کو چبھوتے ہیں

عابدیؔ کھو کے اس کو ہم شب بھر
درد تنہائی میں بلوتے ہیں

سولی پہ انتظار کی چڑھنا پڑا مجھے
شب بھر مثالِ شمع پگھلنا پڑا مجھے

جن راستوں کو چھوڑ دیا تھا ترے لیے
ان راستوں پہ دیکھیے چلنا پڑا مجھے

جس خواب کی لگن میں گزارے تھے روز و شب
تعبیر کی جتن میں بھٹکنا پڑا مجھے

اپنے شعورِ ذات کی کوشش کے باوجود
پھر عاشقی کا زہر نگلنا پڑا مجھے

گھر جل چکا تھا ہاتھ بھی شانوں سے کٹ گئے
اولاد سامنے تھی سنبھلنا پڑا مجھے

راہِ وفا میں عابدؔی آیا وہ وقت بھی
شیشہ مثال گر کے بکھرنا پڑا مجھے

❀

جیسے محفل میں مری ذات کو رد کرتے ہو
صاف لگتا ہے مرا قتلِ عمد کرتے ہو

وہ شجر ہوں جسے صحرا میں اُگایا لا کر
بے سبب تم مرے سائے سے حسد کرتے ہو

اپنی جھولی میں سجاتے ہو شگوفے سارے
اپنے ہاتھوں کو کبھی مثلِ سبد کرتے ہو

جانے کس بات سے تفریق ہوئے ہیں ہم لوگ
تم ہر اک شے میں عبث کینہ و کد کرتے ہو

یوں بھی ہوتا ہے اُتر جاتے ہو دل کے اندر
اور کبھی طرزِ تغافل میں بھی حد کرتے ہو

عابدیؔ زخمِ تمنا کے مناظر سارے
ناتواں دل پہ رقم شوق بصد کرتے ہو

جب ہم بنے تھے یار دو
کیسا تھا دو ہزار دو(۱)

ہوں میں شکستہ پا بہت
بگڑی ہوئی سنوار دو

مجھ پر نہ سلطنت کرو
خود پہ بھی اختیار دو

قسمت پہ دسترس ہے کب
جیسی بھی ہے گزار دو

(۱) 2002

لہجے کے اعتماد سے
لفظوں کو اعتبار دو

نقشِ کہن بنوں گا میں
صدیوں کا انتظار دو

ہوش و حواس نہ رہیں
ایسا کوئی خمار دو

فرصت ملے تو آ ملو
بیٹھیں گے خاکسار دو

آنکھیں ہیں اُس کی یا کوئی
خنجر ہیں آب دار دو

اک پل ذرا سکوں نہیں
آؤ مجھے قرار دو

ہاتھوں میں ہاتھ تھام لو
پھر سے مجھے نکھار دو

کب سے خزاں بدست ہوں
دائم رواں بہار دو

پل پل مرو گے عابدیؔ
عشق کا بھوت اُتار دو

❀

ترے بعد کوئی بھی معتبر نہیں ہو سکا
مرا دردِ دل کبھی مختصر نہیں ہو سکا

یہ جو کارِ عشق تھا نقصِ ذات بنا رہا
بڑی دیر تک تو گیا مگر نہیں ہو سکا

لبِ شاہراہِ گمان سے ذرا دور تھا
میں اسی سبب کبھی رہگذر نہیں ہو سکا

میں غیابِ حُسن میں اپنی جاں سے گزر گیا
مگر اُس کے دل پہ ذرا اثر نہیں ہو سکا

وہ جو آبیار نہ ہو سکا کسی فصل میں
وہ زمینِ دل پہ کبھی شجر نہیں ہو سکا

میں جو راہِ عشق سے ہو کے آیا تھا مُشک بُو
مرا اُس مقام سے پھر گزر نہیں ہو سکا

نہ سمجھ سکے گا وہ عابدیؔ کے کلام کو
جو شعورِ حرف سے باخبر نہیں ہو سکا

❀

جب تلک میں بھی کسی کی رہنمائی میں رہا
لامکاں کا فاصلہ میری رسائی میں رہا

باشاہی میں نہیں پایا خدا کے ملک میں
جو مزہ شہرِ عقیدت کی گدائی میں رہا

زندگی میں نے گزاری ہے کسی کی قید میں
دیکھنے والے یہ کہتے ہیں رہائی میں رہا

اب کہیں جا کر اجل نے جان چھڑوائی مری
مدتوں اہل زمانہ کی خدائی میں رہا

دیکھتے ہی دیکھتے میں ہو گیا خبط الحواس
مشتعل ہو کر محبت میں جدائی میں رہا

زندگی کرنا جہاں تعزیر ٹھہرائی گئی
میں وہاں پر زندگی جیسی برائی میں رہا

عابدیؔ جب تک دیارِ عشق سے نکلا نہیں
اُس گھڑی تک وہ مکملؔ پارسائی میں رہا

❀

کیا سے کیا بنا ڈالا دل نشیں اداؤں نے
مجھ کو ہم نشیں جانا شہر کے گداؤں نے

دل کبیدہ خاطر تھا اُس کا ذکر سنتے ہی
اک دھمال ڈالی تھی دل میں اپسراؤں نے

کون پا پیادہ تھا العطش لیے لب پر
نقش تک مٹا ڈالا دشت کی ہواؤں نے

بول دو جو کہنا ہے اب نہیں ملیں گے ہم
کان میں کہا آ کر مضطرب صداؤں نے

اُس خدائے برتر نے مجتمع کیا مجھ کو
لخت لخت کر ڈالا دہر کے خداؤں نے

کوئی ایک چنگاری دل میں ڈال دی لا کر
جب بجھا مجھے پایا شام کی ہواؤں نے

عابدؔی ترا بچنا اب محال لگتا ہے
ہر طرف سے گھیرا ہے تجھ کو بے وفاؤں نے

❀

خدا کو مان غضب سے نہ یوں پکار مجھے
کرے گا سیلِ رواں پھر سے اشک بار مجھے

میں اپنی آنکھ سے اوجھل رہا ہوں دیر تلک
غموں کی دھول نے ایسا کیا غبار مجھے

میں خودشناس جو ہوتا اگر خدا کی قسم
مرا خلوص رُلاتا نہ بار بار مجھے

رہا ہوں ذات کے بحرِ عمیق میں کل تک
کیا ہے تیری محبت نے آشکار مجھے

فراق دل میں الاؤ جلائے رکھتا ہے
اب ایک پل بھی میسر نہیں قرار مجھے

سوال اب بھی اسی تشنگی میں ہے شاید
میں زندگی یا گئی زندگی گزار مجھے

میرا غنیم مجھے بے ثبات کر نہ سکا
کیا ہے تیرے تغافل نے بے قرار مجھے

رہے جو گردشِ دوراں میں عابدیؔ مرے ساتھ
تمام عمر رہا اُس کا انتظار مجھے

❁

سنا ہے جب سے خدا کا کلام راحت ہے
ہر ایک درس کا موضوعِ عام راحت ہے

کدورتوں سے کشائش ملا نہیں کرتی
جہان بھر کو ہمارا پیام راحت ہے

میں اختیار کے ہوتے ہوئے کہاں خوش تھا
ہوا ہوں جب سے کسی کا غلام راحت ہے

میں دشت و شہر و گلستاں میں بے سکون رہا
کیا ہے ذات میں جب سے قیام راحت ہے

ستا ستا کے پریشان ہو گیا ہے عدو
کئی دنوں سے ہمیں صبح شام راحت ہے

یہ آ رہی ہے مری سمت روکنا نہ اسے
سبک روی سے جو محوِ خرام راحت ہے

دکھی دلوں سے لگاوٹ سے بات کر لینا
سکونِ دل کے لیے احترام راحت ہے

یہ قصرِ لطف بنایا ہے عابدؔی نے مگر
محبتوں میں فقط انہدام راحت ہے

❀

جو ایک بار بھی مجھ سے کبھی ملا نہیں تھا
سوائے اس کے مرا کوئی آشنا نہیں تھا

میں جی رہا تھا حیات وممات کے مابین
فریبِ خواہشِ دنیا میں مبتلا نہیں تھا

میں جانتا ہوں پرستش نہیں ہوئی اس کی
اگرچہ عشق تھا لیکن مرا خدا نہیں تھا

سکوت توڑ کے رختِ سفر اُٹھا کے چلا
بیانِ مرگ مطالب سے ماورا نہیں تھا

ستم شعار نے دامن بھی تار تار کیا
ابھی تو چاک گریبان کا سلا نہین تھا

بس ایک در پہ گزاری گئی حیات کہ اب
اک اور بار بچھڑنے کا حوصلہ نہیں تھا

یہ کیا ہوا ہے تجھے عابدیؔ بتا تو سہی
تو اس قدر تو کبھی مشتعل رہا نہیں تھا

❀

یہ کیا کہ آج مجھ سے دل میں عیّاں سے ہیں
آثار ہو بہ ہو کسی سیلِ رواں سے ہیں

احباب جن کے ساتھ گزاری تھی زندگی
اب وہ خیال و خواب میں وہم و گماں سے ہیں

کھارے ہیں ذائقے میں اگر سوچئے ذرا
آنکھوں میں اشک قلب کے بحرِ گراں سے ہیں

پت جھڑ سے استوار رہے ہیں بہار میں
گل سے تعلقات بھی دورِ خزاں سے ہیں

مدت سے ایک آس کو جنبش نہیں ہوئی
میرے سیاہ بخت بھی کوہِ گراں سے ہیں

جانا اگر ہے ان کو نئی منزلوں کے اور
یہ بھی تو پوچھئے کہ یہ آئے کہاں سے ہیں

مر کے بھی عابدیؔ کو مفر ہو کہاں جناب
دن رات زندگی کے شبِ امتحاں سے ہیں

❁

ہے یہ بات وہم و گمان میں
مری جان ہے تری جان میں

جہاں روشنی کا نہیں گزر
میں رہوں گا ایسے مکان میں

ترے دم سے میری حیاتِ نو
نہیں تجھ سا کوئی جہان میں

یہ غزل کہاں ہے قصیدہ ہے
جو لکھا گیا تری شان میں

تو جہاں ہے جیسے خبر ہوئی
میں پہنچ گیا وہیں آن میں

مری سدِّ راہ کا سوچ لے
کہاں حوصلے ہیں چٹان میں

ترا نقشِ پا پسِ چشمِ نم
بھی رہے گا میری امان میں

کوئی عابدیؔ سا بشر نہیں
کسی عاشقی کے بیان میں

(پیارے دوست غلام غوث گوشی کی نذر)

حزن سے یاس سے بے خوف و خطر جائیں گے
ہم فقط غم کے مقلّد ہیں جدھر جائیں گے

اس لیے پاؤں سے باندھی ہے بگولوں کی رکاب
ہو رہے گھر کے اگر شوقِ سفر جائیں گے

منہدم کرنے کی تعزیر سنانے والے
ہم تو اک چشمِ تغافل سے بکھر جائیں گے

وہ جو آ جائے مرض کان پکڑ کر بھاگیں
اُس کے چھونے سے مقدر بھی سنور جائیں گے

موت کا خوف کسی کو نہیں جینے دے گا
لوگ چلتے ہوئے سائے بھی سے ڈر جائیں گے

عابدیؔ عشق کریں گے جو کیا ہے اب تک
اُس کی بستی میں اگر بارِ دگر جائیں گے

❀

جب کبھی خود سے ہم کلام ہوا
ہر سخن باعثِ دوام ہوا

عمر پا بہ رکاب تھی لیکن
راستہ پھر بھی ناتمام ہوا

اُس کو دیکھا لہو رگوں میں مری
منجمد سے سبک خرام ہوا

حسن خودسر ہے اس قدر صاحب
کتنی مشکل سے آج رام ہوا

اک تلذذ تھی ابتدا میری
کس تکدر پہ اختتام ہوا

دیکھئے عشق میں تغافل سے
کتنے جذبوں کا قتلِ عام ہوا

عابدؔی شاعری کا شغل مجھے
موجبِ تزک و احتشام ہوا

❀

آج روشن جو ماہتاب ہوا
تیرگی کا تو سدِ باب ہوا

کیا صحیفہ مثال صورت ہے
دیکھنا بھی جسے ثواب ہوا

اُس کا پیکر نظر میں گھوم گیا
سامنے جب بھی آفتاب ہوا

وصل کے انتظار میں شب بھر
سانس لینا مجھے عذاب ہوا

حسن کا اعتراف نہ کرنا
ہر حقیقت سے اجتناب ہوا

زندگانی تیاگ دی جس پر
وہ بھی اپنا کہاں جناب ہوا

عابدیؔ دشتِ نارسائی میں
مبتلائے غمِ سراب ہوا

❀

کاش اُس سے جو گفتگو ہو جائے
دل کا ہر چاک خود رفو ہو جائے

وہ ملاقات کا شرف بخشے
آج تکمیلِ آرزو ہو جائے

معجزہ یہ بھی رونما ہو کبھی
وہ سرِ راہ رو بہ رو ہو جائے

اُس کے چہرے پہ جو تقدس ہے
رند دیکھے تو باوضو ہو جائے

آ بھی جا یہ نہ ہو بغیر ترے
کیا خبر مرگِ جستجو ہو جائے

یہ ترے لمس کی کرامت ہے
روح سرشار مشک بو ہو جائے

عشق میں سب دُعائیں ہوں مقبول
عابدؔی اُس میں سرخرو ہو جائے

جب نظر اُس کے رُخ پہ ڈالتا ہوں
زخم ہر روز ایک پالتا ہوں

پھر نیا روپ لے کے آتی ہیں
دل سے یادوں کو جب نکالتا ہوں

وار جس وقت بھی ہوا مجھ پر
اُس کا الزام خود پہ ڈالتا ہوں

پاؤں اُٹھتے ہیں اس گلی کی طرف
کس مشقت سے خود کو ٹالتا ہوں

عابدیؔ مجھ سے شاعری ہے بعید
میں فقط لفظ کو اُجالتا ہوں

❀

دل بہت مضطرب ہے رونے کو
اشک ہیں روح میں سمونے کو

بیج غم کے سنبھال رکھّے ہیں
درد کے موسموں میں بونے کو

خواب کی سلطنت دکھائے گا
جسم اک چاہیے بچھونے کو

سب اثاثے لٹا کے بیٹھا ہوں
اب بچا ہے وقار کھونے کو

میں اگر ہوں مجھے نہیں جانو
اب کہاں رہ گیا ہوں ہونے کو

آ و بیٹھو یہاں اجی چھوڑو
کام کو کاڑھنے پرونے کو

عابدیؔ اور اب رہا کیا ہے
زندگانی خراب ہونے کو

❀

درد جاگے تو خواب سوتے رہے
ہم بھی ایسے میں خوب روتے رہے

زندگی بوجھ بن گئی تھی مگر
ہم اسے خوش دلی سے ڈھوتے رہے

ہم بدلتے رہے لباسِ سخن
یوں خوشی کو غموں میں جوتے رہے

یک بہ یک اشکِ نارسا کل شب
روح کا پیراہن بھگوتے رہے

ہم بھی سب کی خوشی میں خوش ہو کر
عمر بھر اپنا غم بلوتے رہے

عابدؔی جو بکھر گئے تھے کبھی
وہ تعلق سبھی پروتے رہے

❀

جانا مجھے کدھر تھا کس سمت چل رہا ہوں
اک عمر میں تمہارا نعم البدل رہا ہوں

جلتے ہیں لوگ تپتے سورج کی روشنی سے
میں روسیاہ کب سے ظلمت میں جل رہا ہوں

اُترا تھا چاند میری خوابوں کی انجمن میں
میں اُس گھڑی سے اب تک آنکھیں مسل رہا ہوں

اب تک بسی ہوئی ہے خوشبو مرے بدن میں
کہتے ہیں اُس سے باہم دو چار پل رہا ہوں

شاطر ہے وقت دیکھو کیا چال چل گیا ہے
جس کی ہے آج دنیا میں اُس کا کل رہا ہوں

میرے قدم بظاہر آگے کو بڑھ رہے ہیں
لیکن حقیقتاً میں دن رات ڈھل رہا ہوں

اُٹھ کر گرا ہوں اکثر چاہت کی جستجو میں
گر کر میں عابدؔ اب پھر سے سنبھل رہا ہوں

❀

روح کو جسم سے انجان نہ ہونے دینا
دل کی بستی کبھی ویران نہ ہونے دینا

اپنی اولاد کو لاچار سمجھ کر ان کی
خواہشوں کو کبھی قربان نہ ہونے دینا

خوب تحقیق سے کہنا غمِ ہستی پہ غزل
اپنے اشعار کو بے جان نہ ہونے دینا

وحدتِ عشق بھی ہے وحدتِ خالق کی مثال
عشق میں شرک کا امکان نہ ہونے دینا

ایک نسخہ یہ ولایت کا سنا تھا میں نے
اپنے لوگوں کو پریشان نہ ہونے دینا

ذات میں کشف و کرامات سمو لو لیکن
دیکھنے والوں کو حیران نہ ہونے دینا

عابدؔی دہر میں رہنا تو مسافر کی طرح
مستقل ربط کا سامان نہ ہونے دینا

❀

آئینے خواب دیکھ لیتے ہیں
غم کے ابواب دیکھ لیتے ہیں

لوگ آنکھوں میں وسعتیں رکھ کر
صرف تالاب دیکھ لیتے ہیں

مدتیں ہو گئیں خوشی دیکھے
محفلِ ناب دیکھ لیتے ہیں

ہم کبھی اُس سے پھر نہیں ملتے
جس کے القاب دیکھ لیتے ہیں

خوں رُلاتی ہے زندگی کی کتاب
آخری باب دیکھ لیتے ہیں

آپ کا نقش ہے کُھدا دل پر
ہو کے بے تاب دیکھ لیتے ہیں

عابدؔی لوگ بے وفا کیوں ہیں
اُن کے انساب دیکھ لیتے ہیں

❀

کبھی زمیں نہ کہیں آسماں سے نکلے گا
ہمارا راز کسی رازداں سے نکلے گا

وہ ایک اشک مری عاقبت سنوارے گا
شبِ فراق جو چشمِ عیاں سے نکلے گا

مجھے خبر ہے مری موت کا سبب مرے دوست
بس ایک تیر تمہاری کماں سے نکلے گا

میں نارسائی سے امکان کھوج لیتا ہوں
مرا یقین بھی میرے گماں سے نکلے گا

جو بے وفائی سے تعبیر کر رہا ہے مجھے
وہ کم شناس مری داستاں سے نکلے گا

اسے نکالا گیا تھا بہشت سے پہلے
اب اس کے بعد یہ آدم جہاں سے نکلے گا

اب اور ضبط کرے گا تو عابدیؔ تیرا
شکیب آنکھ کے سیلِ رواں سے نکلے گا

ریت کی ٹانگیں رکھنے والے مٹی کے نام نہاد پہلوانوں کے اس خالی شور شرابے میں علی حسین عابدی کا اپنی ''ذاتی'' مضبوط ٹانگوں پر شعری اکھاڑے میں جم کر کھڑے رہنا کسی بھی کرامت سے کم نہیں۔ ان کی شعری ریاضت نے اب نہیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں الفاظ اپنے معنوی گرہیں کھلوانے کے لیے حیطۂ ادراک میں خود بخود کھنچے چلے آتے ہیں۔

عابدی نے ہر شاعر کی طرح اپنے لفظوں کے حُسن سے حیرتوں کے بہت سے نئے جہان کشید کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب ''آیتِ عشق'' کا ایک ایک شعر ان کے ذہین کینوس کا غماز ہے۔ بلکہ اکثر اشعار میں تو نہ صرف شاعر کا بلکہ پڑھنے والے کو خود اپنا دل دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔

عابدی نے اپنی شاعری میں سوچوں کے آسمان کی دھنک کے رنگ تہہ در تہہ سینۂ قرطاس پر سجا کر ایک ایسا رنگین جہان ترتیب دیا ہے جہاں سانس لیتے ہوئے رنگ احساسات کے کتنے ہی عقدے کھلتے نظر آتے ہیں۔

اگر آپ واقعی صدیوں کی شعری پیاس لمحوں کے ہونٹوں پر ٹپکانا چاہتے ہیں تو علی حسین عابدی کی ''آیتِ عشق'' کی الہامی واردتوں میں جا بجا کھلے ہوئے پھولوں کا رس کشید کر لیجیے کیونکہ ان کے اشعار صدیوں کے سمندر لمحوں میں پار کروانے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔

عابدی کے لیے اپنے ان دو اشعار کے ساتھ دعا گو ہوں کہ ''علم کے شہر کا دروازہ'' اپنی تمام تر عنایات کے ساتھ آپ پر ہمیشہ ہمیشہ کھلا رہے۔

وہ غرورِ حُسن ایسی چال چلتا جائے ہے
جلنے والا ہر دیا کچھ اور جلتا جائے ہے
پشتِ انگشتِ شہادت پر لیے بحرِ رواں
سینہ ساحل پہ صاحب مونگ دلتا جائے ہے

طاہر عدیم صاحب
جرمنی



کربِ تخلیق کا چھایا رہا منظر مجھ پر
آیتِ عشق اُترتی رہی شب بھر مجھ پر

عابدی عشق عداوت ہے کہا تھا اِک دن
عکس میرا ہی چلانے لگا خنجر مجھ پر

فکشن ہاؤس
لاہور • حیدرآباد • کراچی
@fictionhousepublishers www.fictionhouse.com.pk
ISBN 978-969-562-218-1